الحاج پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

امانت و دیانت کا سبق

اس وسیع و عریض کائنات میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا عمل اُن کی ذات تک محدود رہتا ہے، کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مخصوص دَور میں دوسروں کے لئے مثال یا نمونہ بن جاتے ہیں لیکن آنے والا وقت ان کے عمل کے روشن نگینوں پر گرد ڈال دیتا ہے اور یہ گرد اس لیے پڑ جاتی ہے کہ اُن کا عمل مخصوص معاشرے اور مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جب وہ معاشرہ اور تہذیب ختم ہو جاتی ہے تو اُن کا عمل بھی ذہن سے فراموش ہو جاتا ہے مگر اللہ کے کچھ منتخب بندے ایسے ہوتے ہیں جن کا عمل ساری کائنات کے لیے حجت ہوتا ہے چونکہ اُن کے عمل کی اساس وقت کی پابندی نہیں ہوتی اور حدودِ زماں و مکاں سے ماورا ہوتی ہے اس لیے کتنے ہی انقلابات آئیں، تغیرات ہوں، تبدیلیاں ہوں، ان کا عمل منارۂ نور کی طرح روشن رہتا ہے اور دنیا کے لیے راہِ ہدایت اور وسیلۂ نجات بنتا ہے۔

انہی افراد کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ان کے درجات اور سطحیں مختلف ہوتے ہیں کبھی نبی کہہ کر یا کبھی رسول کہہ کر، کبھی امام کعبہ کہہ کر ان کا تعارف کرایا جاتا ہے مگر ان سب کا مقصد و مشن ایک ہوتا ہے اور وہ مشن ہوتا ہے "دنیا کے سامنے ایک اعلیٰ معیار پیش کرنے کا"۔ ایک اور پہلو پر غور کر لینا چاہیے۔ عمل اگر نظریہ اور علم نہیں رکھتا تو پھر وہ ایک ذات تک محدود ہو جاتا ہے بے شک اُس کو جزاء ملے گی لیکن وہ ماضی کی شئے بن جاتا ہے مستقبل کو اپنی گرفت میں نہیں لے پاتا۔ وہی عمل مستقبل پر محیط ہو جاتا ہے جس کی اساس علم اور آگہی، بصیرت و معرفت پر ہوتی ہے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کی قدر و قیمت عمل سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی بھی پیغام، کوئی بھی درس، کوئی تصور، کوئی اُصول - بے شک لفظوں کا پیکر ہوتا ہے لیکن اگر اس کے اندر عمل خون بن کر نہیں دوڑ رہا ہے تو پھر وہ الفاظ لاش کی طرح نظر آتے ہیں۔ ایسی لاش جسے مسالہ لگا کر تابوت میں رکھ دیا گیا ہو۔ لیکن جب

الفاظ کا مفہوم عمل سے ظاہر ہوتا ہے اور عمل، الفاظ کی شناخت کراتا ہے تو پھر الفاظ خود بولنے لگتے ہیں اور اس طرح بولتے ہیں کہ اُنہیں سنتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حدودِ وقت سے کوئی آگے نکل گیا ہے۔

نہج البلاغہ - امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات، خطبات، فرمودات و مکتوبات کے مجموعہ کا نام ہے اور علماء کے نزدیک قرآنِ حکیم کے بعد دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے جسے فصاحت اور بلاغت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے حالاں کہ یہ الفاظ یعنی فصاحت و بلاغت و شاہکار انسانی عجز کا اظہار ہے اور اس کتاب کی صحیح خوبی و معرفت کا اندازہ صرف ان الفاظ سے نہیں لگایا جاسکتا۔ دراصل انسان کا یہی عجز اسے امام کا اعجاز کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اربابِ شریعت کی نظر میں میرے یہ فقرے مناسب سمجھے جائیں گے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر غلو کا الزام آئے اور میری کم علمی صحیح لفظ کے اظہار سے قاصر ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہج البلاغہ قرآنِ حکیم کی لفظی و معنوی توسیع ہے قرآن میں متشابہات ہیں، مجازات ہیں، نہج البلاغہ میں علامتیں ہیں، تمثیلات ہیں اور استعارات ہیں -اگر فرق ہے تو یہی کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور یہ اللہ کے اس بندے کا کلام ہے جسے خود قدرت نے لسان اللہ کہا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے انسانی علوم اور انسانی بصیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے نہج البلاغہ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے۔ آج مغرب نہج البلاغہ کے ترجمے پڑھ کر انگشت بدنداں ہے کہ جو مسائل اُسے آج درپیش ہیں اُن مسائل کا ادراک چودہ سو سال پہلے عرب کی نیم ترقی یافتہ سوسائٹی میں کر لیا گیا تھا اور نہ صرف ادراک کر لیا گیا تھا بلکہ اُن مسائل کا حل بھی بتلا دیا گیا تھا۔

نہج البلاغہ میں پھیلے ہوئے لاکھوں موضوعات میں سے ہر ایک موضوع پر لاکھوں صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔ اگر میں بھی سعد الدین تفتہ زانی ہوتا یا محمد بن عبدہ ہوتا تو حقِ تشریح ادا کرپاتا۔ میری کج مج بیانی دراصل اُس عظیم بارگاہ میں اعترافِ عجز ہے اور اپنی فہم نارسا کا اقرار ہے لیکن آج کی دنیا کو متوجہ کرنے کے لیے شاید یہ سطور بھی کافی ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دورِ حکومت سے متعلق پہلا واقعہ حضرت عقیل کا ہے۔ دو واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ ۱۔ جب آپ نے امام سے ایک صاع گیہوں بیت المال سے طلب کیا۔ ایسے عالم میں کہ ان کے بچوں کے بال پریشان اور فقر و فاقہ کی وجہ سے رنگ بدلے ہوئے تھے۔

امیر المومنین نے انہیں گیہوں نہیں دیا بلکہ لوہے کا ایک ٹکڑا آگ میں تپا کے اُن کے جسم کے قریب لے گئے اور وہ چیخ اُٹھے۔ اور تب فرمایا کہ تم دنیا کی آگ سے ڈرتے ہو اور میں جہنم کی آگ سے نہ ڈروں؟ یہاں اتنے پہلو قابلِ غور ہیں۔

۱) حضرت عقیل پریشان حال تھے

۲) امیر المومنین کے ہاتھ میں اقتدار تھا

۳) یہ طرزِ عمل اُس شخص کا تھا جس نے خطبہ ۱۴۲ میں فرمایا "جسے اللہ نے مال دیا ہے اُسے چاہیے کہ قرابت داروں سے صلہ رحمی کرے۔ خستہ حالوں کو اُن کی مصیبت سے نجات دلائے، قرض داروں پر بخشش کرے۔ امیر المومنین نے یہ دولت کا مصرف بتلایا ہے۔ اِس روشنی میں اتنی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

۱) کہ دولت کا مصرف صلہ رحمی بے شک ہے لیکن اسی دولت کا مصرف جو ذاتی دولت میں شمار ہو اور اُس وقت جب بظاہر دنیاوی اقتدار امیر المومنین کے پاس تھا تو آپ کے پاس کوئی ذاتی ملکیت نہ تھی۔

۲) اسلامی مملکت کے سربراہ کے پاس کوئی ملکیت نہ تھی۔ اتنا نہ تھا کہ اپنے حقیقی بھائی کو ایک صاع گیہوں دے سکیں۔ اب اِسے آج کے دور میں دیکھیے۔ جب سربراہِ مملکت مختلف ملکوں میں اپنے ذاتی اکاونٹ رکھتا ہے۔ آرام و تعیش کے سارے اسباب فراہم کرتا ہے اور دنیا کے سربراہانِ مملکت کا یہ طریقِ کار امانت و دیانت کے خلاف ہے اِس لیے کہ وہ عوام کی ملکیت کے نگراں ہوتے ہیں اور نگراں کو حقِ تصرف وہی دے سکتا ہے جس کی وہ ملکیت ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ جس کی ملکیت ہو وہ خود تصرف نہ کرے اور دوسروں کو عیش و آرام کی اجازت دے اور اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اسلام میں تقسیم دولت کا جو اصول تھا وہ اقربا پروری، اور خویش نوازی کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ جس کی وجہ سے طبقات اور ٹولے اور دولت مندوں کا خاندان بن سکے۔ آج کی سوسائٹی میں منسٹر کی ڈور سے بھی رشتہ داری ہے، خودرو پودوں کی طرح کوٹھیاں اُٹھنے لگتی ہیں لیکن کیا کہنے جس نے لفظ "امانت" کو اپنے اس عمل سے ایسی معنویت عطا کی کہ یہاں لفظِ امانت خود بول رہا ہے، متحرک ہے۔

ایک اور پہلو-امیر المومنین اپنے طرزِ عمل سے جہاں امانت کے لفظ کی معنویت اور گہرائی کی

طرف متوجہ کر رہے ہیں اور اپنے کلام سے لفظ "امانت" کی تشریح کر رہے ہیں وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں امانت کا تسلسل ہے اور اُس تصوّر کی اہم ترین کڑی امیر المومنین کی ذاتِ گرامی۔ امانت کا نقطۂ اوّل ذاتِ باری ہے جس نے جبرئیل کو امین وحی بنا کر بھیجا اور دنیا کو امانت کی عظمت سمجھائی امانت کا دوسرا نکتہ رسالت ختم المرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں جو اعلانِ رسالت سے قبل بھی عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اور رسالت کے بعد بھی امین رہے۔ جس طرح اطیعو ا اللہ کے بعد اطیعو الرسول اور پھر اولو الامر۔ اُسی طرح امانت کی بھی یہ تین کڑیاں ہیں۔ اللہ، رسول اور علی۔

اسی خطبہ کا دوسرا واقعہ - "دیانت" سے متعلق ہے عام طور پر امانت سے مراد ہے۔

۱) کسی شئے کا موجود ہونا ۲) اُس شئے کا کسی اور کا ہونا

۳) کسی کا اُس شئے پر نگران ہونا اور ۴) جس کی ملکیت ہے اُس کو ویسے ہی پلٹانا۔ اس طرح امانت میں تین کردار ہوں گے۔ شئے، مالک اور نگراں۔ مگر دیانت۔! صرف ایک فرد سے متعلق ہے اس میں مال کا لوٹانا شامل نہیں۔ امیر المومنین کو کسی شخص نے رات میں تحفہ لا کر دیا۔ یہ تحفہ ہدیہ نہ تھا۔ تحفہ اُسی وقت دیا جاتا ہے جب کسی کے عمل سے خوشی حاصل ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفہ علی الاعلان دیا جاسکتا ہے۔ رات کی تاریکی میں تحائف دینے کا مطلب کچھ نفع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرح کا دباؤ۔ مروّت کا دباؤ کہ جسے تحفہ دیا گیا ہے اُس سے اپنی مرضی کے مطابق کام بھی لیا جاسکے۔ مروّت، شرطِ انسانیت ہے لیکن جب عدل و انصاف سے ٹکرائے تو مروت اور پاسداری، جانب داری (جسے Partiality کہتے ہیں) اور تحفہ رشوت بن جاتا ہے۔ سربراہِ مملکت میں اتنی دیانت، فہم و فراست ہونی چاہیے کہ وہ اس طرح کے تحائف کی نوعیت سے باخبر ہو اور یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی الگ تھلگ ایک واقعہ ہے بلکہ اس میں ایک تسلسل ہے۔ حضرت عثمان بن حنیف عامل بصرہ کے نام فرمان حکومت میں لکھتے ہیں جس کے جستہ جستہ فقرے پیش کیے جارہے ہیں۔

"بصرہ کے کسی بڑے آدمی نے تمہیں لالچ میں بلایا۔ جہاں تمہارے لیے رنگا رنگ نفیس کھانے کا انتخاب کیا گیا۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ تم ایسے لوگوں کے کھانے کی دعوت قبول کرلو گے جن کے ہاں غریبوں کو پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا۔ تمہارا امام وہ ہے جس نے دنیا کے مال و متاع میں اپنی دو پھٹی

پرانی چادروں اور کھانوں میں سے اپنی کمائی ہوئی دو روٹیوں پر اکتفاء کر رہا ہے۔"

"اگر میں چاہتا تو اس شہد مصفیٰ خالص گیہوں اور ریشمی پار جاچات کی اپنے مصرف میں لانے کی راہ نکال لیتا لیکن کیا مجال کہ مجھ پر خواہشات نفسانی غالب آتی۔ میں تورات کو پیٹ بھر کر سو جاؤں اور بھوکے پیٹ اور پیاسے کلیجے میرے آس پاس تلملاتے پڑے رہیں!"

خطبہ نمبر ۲۲۴ کے آخر میں اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جو تحفہ دینے والا تھا وہ آپ سے کوئی ایسا کام لینا چاہتا تھا جس سے کسی کی حق تلفی بھی ہوتی تھی۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم اگر ساتوں اقلیم میں اِن چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں صرف اس جرم کے عوض کہ میں چیونٹی سے جَو کا ایک چھلکا چھین لوں تو ایسا کبھی نہ کروں گا"۔

یہ امانت و دیانت کے دو سبق تھے جو بظاہر اخلاقیات تک محدود معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت جن میں سیاسیات اور حکمراں کا تصور بھی موجود ہے جس میں معاشیات کے اعلیٰ اخلاقی اقدار بھی کار فرما نظر آتے ہیں جو اپنے دَور میں بھی اہم تھے۔ اُس دور میں جب قبائلی نظام تھا اور آج کے دور میں بھی جب جمہوری نظام ہے ان اصولوں کی اور اس عمل کی اتنی ہی ضرورت ہے اور یہ ضرورت کسی ایک طبقہ کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی انفرادی زندگی میں امانت و دیانت کی اتنی ہی ضرورت ہے معجز نما کلام کا یہی خاصہ ہے کہ جز پر بھی اتنا ہی محیط ہوتا ہے جتنا کُل پر۔ وہ قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہے اور دجلہ سے پانی کی بوند نکال لیتا ہے۔

جب تک دریاؤں میں روانی رہے گی اور آفتاب و ماہتاب طلوع و غروب ہوتے رہیں گے اور آسمان کے ستارے ایک دوسرے کی طرف جھکتے رہیں گے اُس وقت قول و عمل کے اس آہنگ کا سرمدی نغمہ کائنات میں گونجتا رہے گا اور انسانوں کو دعوتِ عمل دیتا رہے گا۔"[۲]

حواشی :

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۲۲۱

۲۔ ،، ،، مکتوب نمبر ۴۵

❀❀❀